

اور کامیابی حاصل کرے۔ جان پر کھیل جانا اور زندگی سے ہاتھ دھو لینا بید کا درخت نہیں کہ اسے کوئی پھل نہ لگے اور بالکل بے ثمر و بے نتیجہ رہے۔
 بجنوری مرحوم فرماتے ہیں کہ مرزا غالب نے افلاطون کے استاد سقراط کی طرح نہ ہر اب کو ہمیشہ نوش شیریں پر ترجیح دی۔ غالب کا علم الاخلاق جاں سپاری ہے اور :

جاں سپاری شجر بید نہیں

مرزا نے اس شعر میں ایک بہت بڑی حقیقت واضح کی ہے۔ اس دنیا میں جتنے بھی کام ہوئے ہو رہے ہیں یا آئندہ ہوں گے، ان کی تہ میں عشق کا فرما ہے۔ لوگ ہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر پہنچے، انھوں نے اتھاہ سمندر کھنگال ڈالے، بڑا عظیم آباد کر دیے، صحراؤں کو گلزار بنا دیا، قطبین کے راز معلوم کر لیے۔ ایک دوسرے سے بڑھ کر حیرت انگیز ایجادیں کرتے کرتے انھوں نے زمین کا اندرون بھی دیکھ لیا۔ اب ستاروں کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کون سا کارنامہ ہے، جو عشق یعنی ایک خاص لگن کے بغیر انجام پایا اور لگن بھی ایسی کہ ایک کے بعد ایک پشت ہا پشت تک ایک کام کی دھن میں مصروف رہا، یہاں تک کہ کئی پشتوں کے بعد راز ملا اور منزل مقصود تک رسائی نصیب ہوئی۔ اگر عشق تاثیر سے ناامید ہو جاتا اور جابازی و جانفشانی چھوڑ دیتا تو یہ سب کچھ کیونکر بروئے کار آتا؟ انسان کسی مقصد کے لیے جان دینے پر آمادہ ہو جائے تو وہ یقیناً حصول مقصد میں ناکام نہ رہے گا۔ اور انسانی سعی و کوشش کی صورت ایک سلسلے کی ہے۔ ہر انسان قدم بہ قدم آگے بڑھتا جاتا ہے۔ جہاں ایک کی زندگی ختم ہوتی ہے، دوسرا اس کا کام سنبھال لیتا ہے۔ اسی طرح منزل مقصود سامنے آ جاتی ہے۔ یہ بہت بڑی حقیقت ہے، جو آٹھ دس لفظوں میں مرزا غالب نے پیش کر دی۔

اس شعر کی عالمیت و افاقیت کا یہ حال ہے کہ اسے عشق مجازی و عشق حقیقی